امریکی مسلمان: حال اور مستقبل

انیس احمد

نئی دنیا امریکہ میں مسلمانوں کی آمد، ان کی تاریخ اور امریکہ کے مختلف خطوں میں مسلمان برادریوں (communities) کے فروغ کا تاریخی جائزہ اوران کی تعداد کے متعلق اندازے، عرصے سے اکثر امریکی مصنفین کی توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ یہ معلومات بلاشبہ اہمیت رکھتی ہیں اور مسلمانوں کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی کردار کے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ لیکن ہماری اس گفتگو کا محور شمالی امریکہ کے مسلمانوں کے ماضی کی جگہ ان کا مستقبل ہے تاکہ اس بات پر غور کیا جاسکے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور اسلام کے نام نہاد مغرب میں تعمیری کردار کی شکل کل کیا ہونے جارہی ہے۔

عصر حاضر کے بعض دانش وروں نے یہ تاثر ذہن میں قائم کرلیا ہے کہ ۱۱ستمبر تو ابتلاء و آزمائش کا فقط آغاز ہے۔ یہ ایک سمندر میں تیرتے ہوئے برف کے پہاڑ کی محض چوٹی ہے، اس لیے اس کے صحیح قد و قامت کا اندازہ محض چوٹی کی نوک کو دیکھ کر نہیں لگایا جاسکتا۔ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ۹/۱۱ کی حیثیت ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت بطور خطرے کی گھنٹی کی ہے، تو کیا کسی ایسی قیاس آرائی کے نتیجہ میں امریکی مسلمانوں اور امریکہ میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں فاتحہ پڑھ کر بیٹھ جانا ایک دانش مندانہ اور ذمہ دارانہ طرز عمل کہا جاسکتا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ۱۱ستمبر کے اصل محرک امریکہ میں neo-con کے فلسفہ کے علمبردار ہوں یا ایسے غیر دانش مند مسلمان جنہیں ان جارحیت اور روایت پرست امریکی اداروں نے استعمال کیا ہو، اس واقعہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ۱۱ستمبر کے بعد امریکہ میں مقیم مسلمانوں کا وجود ان عناصر کے لیے پریشانی اور فکر کا باعث بنتا جارہا ہے۔ ۱۱ستمبر کے بہانے سے ان امریکی قدامت پسندوں کو عالمی دہشت گردی کو ختم کرنے کے بہانے سے افغانستان اور عراق پر قبضہ کرنے میں بظاہر آسانی ہوگئی اس کے ساتھ ساتھ خود امریکہ میں

جمہوری روایات کی جگہ 'قومی تحفظ' کے نام پر امریکی شہریوں کوخوف زدہ کرنے، تشدد کا نشانہ بنانے اور بلا کسی جمہوری قانونی کارروائی کے ان کی گرفتاری اور ان کے اثاثوں کو قبضہ میں کرنے کا جواز بھی مل گیا۔ گویا ۱۱ ستمبر کا واقعہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام جمہوریت پسند امریکیوں اور خصوصاً حکومت سے صحت مند اختلاف کرنے والوں کے لیے ایک دورِ آزمائش کے آغاز کے اعلان کی حیثیت رکھتا ہے۔

امریکہ میں مقیم بہت سے مسلمان جو امریکی معاشرہ کے بظاہر کھلے اور دوستانہ ماحول کو حقیقت واقعہ سمجھتے تھے، ۱۱ ستمبر کے بعد شدید ذہنی صدمہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کی تصوراتی جنت ریت کے قلعے کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے ڈھے گئی ہے اور بعض پر اس حد تک ردعمل ہوا ہے کہ وہ امریکہ کو خیرباد کہہ کر اپنے آبائی وطن واپسی کے لیے کمر کس رہے ہیں۔ گو ان کا ایسا کرنا ۱۱ ستمبر کی منصوبہ بندی کرنے والوں کی توقعات کے عین مطابق ہے یہ سوال جواب طلب رہتا ہے کہ کیا ان کے امریکہ چھوڑ دینے سے اسلام دشمنی یا مسلمانوں سے منافرت ختم ہو جائے گی؟

گو امریکی حکومت اور خاص طور پر ۱۱ ستمبر کا منصوبہ بنانے والے ادارے اس بات کو تسلیم نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس ایک سانحہ کے نتیجے میں اسلام دشمن قوتوں کو جو فوائد حاصل ہوئے ہیں وہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مغربی استعمار کو حاصل ہونے والے مجموعی فوائد سے کسی طرح کم نہیں کہے جا سکتے۔ امریکہ میں قدامت پسند (neo-con) گروہ کی بالادستی، مشرق وسطیٰ میں تیل کے ذخائر پر قبضہ، وسط ایشیا میں اثر و نفوذ قائم کرنے کے لیے افغانستان کی شکل میں ایک اچھی کمین گاہ کا حصول اور نہ صرف مسلم ممالک بلکہ دیگر ترقی پذیر ممالک میں امریکہ کے حسبِ منشاء تبدیلیٔ اقتدار کا اختیار --- یہ محض چند ظاہری فوائد ہیں جن کے ڈانڈے ۱۱ ستمبر سے جا کر ملتے ہیں۔

فی الوقت ہمارا موضوع ۱۱ ستمبر نہیں بلکہ اس کے نتیجہ میں امریکی مسلمانوں کا حال اور مستقبل ہے، اس لیے ہم بات کو اسی حد تک رکھتے ہوئے صرف مسلمانوں کی اس نفسیات کی طرف اشارہ کریں گے جس نے ان میں سے بہت سوں کو اپنے آبائی ممالک واپس جانے کے بارے میں غور کرنے یا عملاً منتقل ہونے پر مجبور کیا اور جو ہماری نگاہ میں امریکی مسلمانوں کے مفاد کے منافی ہے۔ امریکہ میں مسلمانوں کے آ کر مقیم ہونے کے اسباب جو بھی ہوں، حصول تعلیم و ملازمت کے بعد ان کا وہاں مستقلاً رک جانا ہو یا پیشہ ور

اور اہل فن ہونے کی بنا پر ان کا امریکی معاشرہ اور نظام کو اپنی خدمات فراہم کرنا، معاشرتی اور سیاسی وجوہات کی بنا پر مہاجرت ہو یا اور دیگر اسباب---حقیقت یہ ہے کہ آبادی کا دو سے ڈھائی فیصد ہونے کے باوجود امریکی مسلمان آج امریکہ میں ایک سیاسی قوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ صدر بش کے انتخاب میں فلوریڈا اور دیگر مقامات میں مقیم مسلمانوں کا ووٹ فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ اور یہ مستقبل میں اس سے زیادہ وزن اختیار کر جائے گا۔

مسلمان ووٹروں کی تعداد میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے وہ شکل نہ وہاں کی یہودی آبادی میں پائی جاتی ہے نہ عیسائی آبادی میں۔ ہاں اسپینی نژاد امریکیوں میں اس قسم کا رجحان نظر آتا ہے اور وہ مستقبل میں مسلمانوں کی طرح ایک فیصلہ کن ووٹ بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ گویا سیاسی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کا امریکہ چھوڑ کر جانا ان قوتوں کے لیے بہت خوشی کا باعث ہو گا اور پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں کے ووٹ کو کمزور بنا دے گا۔

ایسے ہی اگر دیکھا جائے تو تعلیم کے لحاظ سے مسلمان اس وقت امریکہ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں ان کی اولاد غیر مسلم امریکیوں سے ہر لحاظ سے افضل کہی جا سکتی ہے۔ وہ مقابلتاً زیادہ محنتی اور منظّم (disciplined) نظر آتے ہیں، جبکہ غیر امریکی طلباء میں یہ رجحان نظر نہیں آتا۔ اس لیے وہاں پر پیدا ہونے والے اور تعلیم پانے والے مسلمانوں کا مستقبل میں بطور elite اہم کردار ادا کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

دوسرا اہم نکتہ جو مسلمانوں کی حالیہ صورت سے متعلق ہے وہ اسلامی مراکز و مساجد سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۱ ستمبر کے بعد سے ان اداروں کی امریکی انتظامیہ کی طرف سے نگرانی اور جاسوسی کی جا رہی ہے اور ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہوئے اور انہیں مشتبہ سمجھتے ہوئے دہشت گردی کے مراکز تصور کر لیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے اور ہزاروں مساجد و مراکز میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس غلط فہمی کے ذمہ دار یہ ادارے خود ہیں۔ ایک عرصہ سے میدان میں ہونے کے باوجود انہوں نے اپنا تعمیری اور مثبت کردار دوسروں پر واضح نہیں کیا۔ جبکہ مسجد اور اسلامی مراکز ایسے ادارے ہیں کہ اگر یہ مسلمانوں کی صحیح

تصویر کشی کرتے تو مسلمانوں اور ان اداروں پر آج جو بہتان لگائے جا رہے ہیں امریکی عوام ان کی حقیقت سے آگاہ ہوتے اور ان الزامات کو خود رد کر دیتے۔

مسلمانوں کے حالیہ مسائل میں سے بعض کا تعلق ۱۱ ستمبر سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی عام نفسیات سے ہے۔ مسلمانوں نے عموماً امریکہ میں اپنے قیام کو عارضی سمجھا اور وہ مسلمان بھی جو اپنے آبائی وطن سے بظاہر کشتیاں جلا کر امریکہ آئے، امریکہ کی پُر آسائش زندگی کی حد تک امریکہ سے وابستہ رہے لیکن مشکلات اور آزمائش کے لیے ذہناً کبھی تیار نہ تھے۔ چنانچہ مشکلات پیش آنے پر بادل ناخواستہ اپنے آبائی وطن واپس جانے پر آمادہ ہو گئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام نہ کسی خطے تک محدود ہے نہ وہ کسی جغرافیائی حدود سے وابستہ ہے۔ اس لیے جو مسلمان امریکہ جا کر آباد ہوئے، وجہ کچھ بھی ہو، ان کا فرض تھا کہ وہ ان اداروں کے قیام کی کوشش کرتے جو انہیں معاشرہ میں مضبوط جڑیں فراہم کر سکتے۔ ان میں اولین اہمیت تعلیمی اداروں کی ہے اور پھر معاشرتی ادارے خصوصاً خاندان کا ادارہ۔ بلاشبہ گزشتہ دو دہائیوں میں امریکی مسلمان اس جانب متوجہ ہوئے ہیں لیکن اتنی تاخیر سے جب اچھا خاصا پانی پل کے نیچے سے بہہ چکا تھا۔

اس کے دو نتائج بہت واضح ہوئے۔ پہلا ذہنی طور پر ایک مہمان یا مسافر کی سی نفسیات کا پیدا ہونا کہ اگر مسائل و مشکلات کا سامنا ہو جائے تو سمندر پار گھر تو موجود ہے وہاں امن و سکون سے جا کر باقی زندگی گزار لی جائے گی اور دوسرا یہ کہ تربیت اولاد کے حوالے سے تعلیمی اور معاشرتی اداروں کی عدم موجودگی یا ناقص ہونے کے سبب آج بہت سے مسلمان گھرانوں کو انہی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن کے دیگر امریکی شکار ہیں، یعنی ۱۳ سال سے ۱۹ سال کی عمر کے بچوں کے نفسیاتی اور نفسی مسائل۔ ایسے ہی مسلم روایت کے برعکس طلاق کا بڑھنا اور بعض اوقات لڑکیوں کا غیر مسلم امریکیوں کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا۔ یہ مسائل اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ گو مسلم کمیونٹی تعداد کی کثرت اور سیاسی ووٹ کی بنا پر اہمیت اختیار کر گئی ہے اس کی نظریاتی اور ثقافتی بنیادیں ابھی تک مستحکم نہیں ہو سکی ہیں۔ کیا یہ بنیادیں اسلامی ریاست کے قیام کی محتاج ہیں؟

کیا امریکی مسلمانوں کو بھی مسلم ممالک کے باشندوں کی طرح امریکہ میں اسلامی نظام کے قیام

کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے تا کہ وہ اپنی معاشرت وثقافت پر عمل کرسکیں؟ یا وہ مروجہ نظام میں رہتے ہوئے اپنی ثقافت اور عقیدہ کے تحفظ کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنائیں؟ اس سوال کا تعلق امریکی مسلمانوں کے حال اور مستقبل دونوں کے ساتھ ہے۔ کھلے ذہن اور واضح تصور کے بغیر یہ سوال ہر قدم پر ان کے لیے پراگندگی کا باعث بن سکتا ہے اور غالباً بن رہا ہے۔ لیکن اس پر غور کرنے سے قبل یہ بات بھی ہمارے ذہن میں واضح ہونی چاہیے کہ کیا قرآن وسنت کی تعلیمات صرف ایسے مقامات پر رائج کرنے کے لیے آئی ہیں جہاں پہلے سے مسلمان اکثریت میں ہوں اور انہیں ایک خطہ زمین ایسا مل گیا ہو جس پر وہ اسلامی نظامِ اخلاق، سیاست ومعیشت کو نافذ کرسکیں یا اسلام ان مقامات سے بھی مناسبت (relevence) رکھتا ہے جہاں صرف ایک مسلمان ہی ہو اور غالب اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔

کیا ایک مثالی اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر مسلمان اپنے عقیدہ پر عمل نہیں کر سکتے؟ اور کیا اسلامی ریاست بجائے خود ان کے مسلمان ہونے کے لیے pre-requisit ہے یا ایک اجتماعی ہدف ہے۔ کیا اسلامی ریاست اور معاشرتی اصلاح یا ایک صالح معاشرہ کے قیام کی جدوجہد میں کوئی ٹکراؤ ہے یا جب تک ریاست کا قیام ممکن نہ ہو، اس کے قیام کے واضح ہدف کو سامنے رکھتے ہوئے، اسلامی اصولوں پر مبنی خاندان اور معاشرت اس ہدف کے حصول کے لیے راستہ ہموار کرنے کے بہترین ذریعے نہیں ہیں؟

ہم سمجھتے ہیں کہ امریکی مسلمانوں کو سب سے زیادہ جس چیز کی فکر ہونی چاہیے وہ ان کا بطور ایک اقلیتی گروہ کے محض اپنی روایات کا تحفظ نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی صحیح معنوں میں نمائندگی اور امریکہ میں تعمیری اور صحت مند تصورات کو بلاتفریق رنگ ونسل ومذہب امریکی شہریوں تک پہنچانا ہونا چاہیے۔ گویا دوسروں تک پہنچ کر اور امریکی معاشرہ کے مسائل سے پوری آگاہی کے ساتھ اس کے تعمیری حل پیش کرنا۔ یہ فکری اور عملی تعامل (interaction) ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے۔

جہاں تک سوال ایک غیر مسلم نظام میں رہنے اور اسلام کی آفاقی اور عالمگیر اقدارِ حیات پر عمل کرنے کا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جہاں کہیں تنہا ایک مسلمان بھی ہو اس کا فرض ہے کہ اپنے دائرہ کار میں وہ جتنی استطاعت رکھتا ہو اس حد تک نہ صرف خود اسلامی تعلیمات پر عامل ہو بلکہ اپنے ماحول کو بھی ان کے تابع بنانے کے لیے جدوجہد کرے۔ اس لیے امریکی مسلمانوں کا وقتی مخالفت، منافرت یا جارحیت

سے گھبرا کر میدان دعوت کو چھوڑ دینا حکمت کے منافی ہے۔ ہاں بدلے ہوئے حالات میں دعوت کے اسلوب اور ترجیحات پر لازمی طور پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور اس کا فیصلہ وہی حضرات کریں گے جو مخصوص حالات میں کسی ملک میں رہتے ہوں۔

یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ امریکی استعمار بھی سابقہ سوویت یونین کی طرح شکست و ریخت کے اس مرحلہ میں داخل ہو چکا ہے جب نظام کی تبدیلی ایک فطری تقاضا بن جاتی ہے۔ امریکی مسلمانوں کو امریکہ کی بہتری اور وہاں پر ایک اچھے اخلاقی معاشرہ کے قیام کے لیے سسٹم میں رہتے ہوئے اس کی اصلاح کرنی ہوگی۔ یہ خیال کہ تبدیلی باہر سے لائی جا سکتی ہے فکری پراگندگی کی علامت ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو مروجہ اداروں میں شمولیت اختیار کر کے اندر سے ان کی اصلاح کی کوشش کرنی ہوگی۔ اگر اس کوشش میں خلوص نیت ہے اور مطلوب محض ایک مذہبی اقلیت کا مفاد نہیں ہے بلکہ مجموعی آبادی کی فلاح مقصود ہے تو مسلمانوں کو معاشرتی سیاسی اور ثقافتی سطح پر غیر مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرتے ہوئے اسلام کے آفاقی اور عالمگیر اخلاقی اصولوں کو عام انسانوں کی فلاح و نجات کے حوالے سے پیش کرنا ہوگا۔ قرآن کریم نے بار ہا اس طرف متوجہ کیا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے اخلاقی ضابطہ ہے وہ کسی گروہ، نسل یا خطے تک محدود نہیں ہے۔ امریکی مسلمانوں کو اسلام کے خاندانی نظام، اخلاقی تعلیمات اور معاشی و معاشرتی مسائل سے متعلق ہدایات کو امریکی معاشرہ سے برائیوں کو مٹانے اور اچھائیوں کے فروغ کے لیے بطور متبادل حل کے اپنے عمل اور گفتگو سے واضح کرنا ہوگا۔

امریکی مسلمان جو بڑی حد تک اپنی عبادات کا اہتمام کر لینے اور بچوں کو ویک اینڈ سکول میں ہفتہ میں ایک دن چند قرآنی سورتیں اور دعائیں یاد کرا کے کاروبار حیات میں مگن ہو جانے کے عادی رہے ہیں اب انہیں اپنے ہر عمل کو دیگر افراد کے سامنے یوں رکھنا ہوگا کہ دیکھنے والے محض ان کے بارے میں نہیں بلکہ اسلام کے بارے میں مثبت تاثر لے کر اٹھیں۔

اس باہمت عمل کو استقامت کے ساتھ نتائج سے لاپرواہ ہو کر کیا گیا تو جلد غیر مسلموں کے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تعصب، گمراہی بلکہ ناپسندیدگی میں کمی واقع ہوگی اور مسلمانوں کو دوبارہ اندرونی اعتماد حاصل ہو سکے گا۔ اندرونی یقین اور باہمی اعتماد کے بغیر کوئی معاشرہ صحت مند طور پر کام نہیں کر سکتا۔